علامہ اخلاق حسین دہلوی

تحقیقی مضامین کا اسلوب

(تحقیق اور منہاجِ تحقیق سے متعلّق چند تصریحات)

تحقیق کے معنی ہیں کھوج لگانا اور حقیقتِ حال کو دریافت کرنا۔ تحقیق کی بنیاد ہمیشہ اعلیٰ اصولوں پر ہوتی ہے، جو فطرت کے مطابق ہوتے ہیں۔

ا۔ تحقیق میں، معلومات فراہم کرنا، سلیقے سے اس کو مرتّب کرنا، کامل احتیاط اور انضباط سے کام لینا اور موضوع سے متعلق اصول کو برتنا پڑتا ہے۔ اور چوں کہ اقتباسات، موضوع کو صحت سے زیادہ قریب رکھتے ہیں لہٰذا اقتباسات کا شمول بھی ازبس کہ ضروری ہوتا ہے۔ گویا کہ معقول دلائل، حوالہ جات اور اقتباسات اور برمحل تبصرہ تحقیق کے لوازم ہیں تا کہ بات سے بات نکلتی چلی آئے اور لڑی سے لڑی جڑتی چلی جائے اور مفہوم آئینے کی طرح جلا پاتا رہے۔ یہ ہے تحقیقی مضامین کی تدوین کا طریقۂ کار۔

۲۔ فراہمیِ معلومات اور تلاش و تجسس میں پوری کوشش صرف کرنی ہوتی ہے اور کمالِ عرق ریزی اور جاں فشانی سے کام لینا پڑتا ہے، سرسری قلم برداشتہ لکھ دینے سے تحقیق کا حق ادا نہیں ہوتا اور نظرِ تحقیق سے اسے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی تحریر سے نہ ظنِ غالب کو فائدہ پہنچتا ہے اور نہ اس میں کوئی پایہ داری ہوتی ہے اور نہ وہ کسی الجھے ہوئے مسئلے کو سلجھا سکتی ہے۔ تحریر میں خونِ جگر کی جتنی چاشنی ہوگی اتنی ہی وہ مؤثر ہوگی۔

۳۔ تاریخی پس منظر سے آگاہی، گردوپیش کے حالات سے واقفیت اور عصری رجحانات سے باخبر ہونا بھی تحقیق نگار کے لیے لابدی ہے کیوں کہ صحیح تاریخی شعور کے بغیر تحقیق نگار کا ہر قدم کعبے کو نہیں ترکستان کو اٹھتا ہے، اور وہ گم راہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ تحقیق میں روایت و درایت، حال و ماحول، ماضی و مستقبل سب ہی سے کام لینا ہے اور عملِ تنقیح سے ہر بات کو صاف و منقح کر کے پیش کرنا پڑتا ہے۔ تحقیق میں من مانی نہیں چلتی بلکہ دائرۂ عمل میں رہتے ہوئے پورے حزم و انضباط کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ تحقیق ایک مستقل فن ہے۔ خیالات کی وادیوں میں بھٹکتے رہنے والے صوفی و مرتاض بزرگوں میں وہ ثبات و قرار کہاں جو اس سیلِ تُندرو کی مقاومت کر سکیں۔ لامحالہ کہیں الحاق و تحریف سے استعانت حاصل کرنی پڑتی ہے اور کہیں کذب و افترا سے کام نکالنا پڑتا ہے۔ درحقیقت ایسے بزرگ اس میدان کے مرد نہیں ہوتے، اگر جذبات سے مغلوب ہو کر کبھی میدان میں اُتر بھی پڑتے ہیں تو انجام کار تیورا کر اُلٹے پھر جاتے ہیں۔ غرض کہ تحقیق ایک خارزار ہے۔ اس میں سے سلامتی کے ساتھ گزر جانا ہر کس و ناکس کا کام نہیں، مگر جسے خدا توفیق دے۔ یخلق مایشاء و یختار۔

۴۔ تحقیق، جذبۂ زندگی سے وجود میں آتی ہے اور وہ بذاتِ خود زندگی تصور کی جاتی ہے۔ تحقیق کے باب میں نہ صرف کتابوں کا علم اور کتابوں کا مطالعہ کافی ہوتا ہے بلکہ کائنات کا علم اور زندگی کا مطالعہ اور نفسیات سے واقفیت بھی درکار ہوتی ہے۔ جو اس سے بے بہرہ ہے وہ کتنا ہی کثیر المطالعہ کیوں نہ ہو کتنا ہی عابد و زاہد کیوں نہ ہو، اس راہ کا راہ رو نہیں ہوتا اور اس کی تحقیق نما تحریر، افسانہ گوئی، بُت گری اور مدحت سرائی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

۵۔ ذہن کا رسا ہونا اور طبیعت کا نکتہ رس ہونا، تحقیق نگار کا خصوصی وصف ہے۔ اور اگرچہ یہ خوبی فطری ہوتی ہے لیکن مشق و ممارست اور مطالعے و تجربے سے اور عملِ پیہم کی برکت سے پروان چڑھتی اور پختہ ہوتی اور جلا پاتی ہے اور جب تک یہ وصف حدِ بلوغ کو نہیں پہنچتا، تحقیق کا حق ادا نہیں ہوتا۔ ذہنی کاہلی اس راہ میں بدترین گناہ ہے۔ جو تحقیق، ذہنی کاہلی کی پیداوار ہوتی ہے صدا بصحرا ہو کر رہ جاتی ہے اور ابدیت اور مقبولیت سے محروم رہتی ہے۔

۶۔ تحقیق کا اور تنقید کا اور تنقیح کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہر وہ شے جو دائرۂ تحقیق میں جگہ پانے کی مستحق تصور کی جاتی ہے، اس کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنا پڑتا ہے اور اس کے عیب و صواب اور حسن و قبح سے آگہی حاصل کرنی ہوتی ہے اور عملِ تنقیح کے ذریعے اسے صاف ستھرا کرنا ہوتا ہے تاکہ کسی قسم کا تکدر باقی نہ رہے۔

تحقیق میں روایت و درایت، حال و ماحول، توازن و توافق، تحلیل و تجزیہ، سب ہی سے کام لینا پڑتا ہے لیکن کہیں کھل کر سامنے آنا ہوتا ہے اور کہیں رمز و کنایہ سے کام نکالنا پڑتا ہے، اور یہ موقع شناسی پر مبنی ہے۔ کلام کی روح کو سمجھنے اور حقائق سے آگاہ ہونے کی کوشش کرنی لازم ولابد ہے، جب کہیں حقیقتِ حال کا انکشاف ہوتا ہے اور صحیح نتیجے پر پہنچا جاتا ہے۔

تحقیق نگار کو تصویر کے دونوں رُخ دیکھنے اور دکھانے ہوتے ہیں۔ حسن و قبح کو جانچنا، پست و بلند پر نظر رکھنا، ابہام اور الجھاؤ کو سلجھانا اور کذب و افترا کا پتا چلانا، خصوصاً جب کذب و افترا، سچ کا چولا پہن کر نمودار ہوا ہو تو مزید کاوش اور دل سوزی سے کام لینا ہوتا ہے، جب کہیں جا کر تحقیق نگار اپنے فرض سے عہدہ برآ ہوتا ہے۔ رطب و یابس کو جمع کر دینے کا نام تحقیق نہیں۔ تحقیق کے باب میں جانب داری اور یک رخی تصویر بنا دینا نری بددیانتی ہے جو ایمان کو سوخت کر دیتی ہے۔

۷۔ افکار و خیالات کی آزادی بھی تحقیق نگار کا فطری وصف ہے۔ وہ روایات کو جانچتا، پرکھتا اور ردّ و قدح سے کام لیتا ہے۔ انھیں اپناتا اور قبول بھی کرتا ہے، لیکن وہ روایات کا پجاری، قدامت کا پرستار اور لکیر کا فقیر نہیں ہوتا۔ وہ ذہنی غلامی اور مرعوبیت سے کنارہ کش رہتا ہے۔ وہ حقائق کا جویا اور صداقت کا متلاشی ہوتا ہے۔ وہ فلک الافلاک کی سیر کرتا ہے لیکن تحت الثریٰ کی خبر بھی رکھتا ہے۔ وہ جنبشِ قلم سے حقائق کے چہرے سے پردہ اٹھاتا ہے اور حق سے روشناس ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی روشناس کرتا ہے۔ حق و باطل کا امتیاز اس کی ادنیٰ سی جنبشِ قلم کا نتیجہ ہوتی ہے۔ لیکن وہ کور ذوق اور بدباطن جنھیں اتنا بھی شعور نہ ہو کہ طبع اول اور جلد اول میں بھی امتیاز نہ کر سکیں، وہ لاکھ محققین کا روپ بھر کے آئیں اور جُل دینا چاہیں وہ ہرگز قابلِ اعتنا نہیں ہو سکتے اور انھیں کوئی محقق نہیں مان سکتا۔ پھر ان کا یہ دعویٰ کہ مخالف و موافق کتب سے تحقیق کر کے لکھا ہے کتنا مضحکہ خیز اور کس قدر لغو ہے۔ اگر کوری جہالت نہیں تو اور کیا ہے۔ اس سے زیادہ حمق میں مبتلا عقل کے دشمن اور باطل کے طرف دار وہ ہیں جو ایسی حماقت مآب تحریر کو تحقیق سے تعبیر کرتے ہیں اور دنیاوی نام و نمود کے لیے مہرِ تصدیق ثبت کر کے مخلوق کو گم راہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بہرحال تحقیق نگار کو فکر و نظر کی آزادی حاصل ہوتی ہے لیکن مطلق العنانی اس کا وصف نہیں ہوتا بلکہ اسے ہر قدم پر حق و باطل کا امتیاز رکھنا ہوتا ہے اور کہیں کج روی اختیار نہیں کرنی پڑتی، جہاں بھی راہِ راست سے بھٹکے گا گم راہ ہو جائے گا اور پھر اسے حقائق کی جانب عود کرنا پڑے گا۔

۸۔ جذبات کی عکاسی اور واردات کی ترجمانی تحقیق نگار کا فرضِ منصبی ہے لیکن جذبات سے

کھیلنا اس کا وصف نہیں، بلکہ کامل حزم واحتیاط سے کام لینا اس کے لیے اشد ضروری ہے۔ جو تحقیق نگار جذبات پر قابو پانے کا وصف نہیں رکھتا وہ جذبات وتوہّمات کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کی قلمی کاوش تمام تر جذبات کی دلدل بن کر رہ جاتی ہے، اور اس سے کسی کو بھی فائدہ نہیں پہنچتا، البتہ اس سے عبرت حاصل کی جاسکتی ہے۔

۹۔ بلاشبہ ذوقِ سلیم بھی تحقیق کی راہ میں معاون ومددگار رہتا ہے، جو اہلِ ذوق اور اہلِ نظر میں بقدرِ مشترک پایا جاتا ہے۔ حسن کا معیار مختلف سہی لیکن حسن کا احساس مشترک ہی ہوتا ہے۔ اگر ذوقِ سلیم کا وصفِ مشترک نہ ہو تو کسی مسئلے میں متفق ومتحد ہونا بہ منزلہ محال ہو جائے گا۔ البتہ درجات میں فرق ہوتا ہے اور ہوسکتا ہے اور یہ فرق شغف اور انہماک کی بدولت رونما ہوتا ہے۔ جن امور کی جانب میلان وشغف زیادہ رہے گا ذوقِ سلیم کا وہی رخ زیادہ اجاگر ہوگا اور اسی کے ذریعے فنی الہامات زیادہ ظہور پذیر ہوں گے، باقی پہلو مکدّر رہیں گے یا اس درجے کی جلا اُن پر نہ ہوگی، اور بادی النّظر میں ذوقِ سلیم مختلف نظر آئے گا، لیکن یہ خلافِ واقعہ ہے۔ ذوقِ سلیم ہی وہ جذبہ ہے جس کی برکت سے آئین وقوانین وضع ہوتے ہیں اور حق وباطل میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ ادب وتحقیق کی راہ میں ذوقِ سلیم خضرِ راہ کا کام دیتا ہے جو بتدریج ترقی کرتا ہے اور پختہ ہوتا ہے۔

۱۰۔ تحقیق نگار کو زبان پر قدرت اور اسالیبِ بیان سے آگاہی لازم ہے، تاکہ وہ مفہوم ومطالب کو خاطر خواہ ادا بھی کر سکے، اور جن رشحاتِ قلم کو وہ بنیادی طور پر پیشِ نظر رکھنا چاہتا ہے ان کے قلم کاروں کے اسلوبِ بیان اور خصائصِ قلم سے آگاہ بھی ہو، بلکہ ان پر کامل عبور ہونا چاہیے۔ ان کی علمی منزلت سے بھی واقف ہونا چاہیے۔ اس سے بھی باخبر رہنا چاہیے کہ وہ کہاں تک اہلِ علم میں مقبول اور مستند ہیں اور ان کی قلمی کاوش کیا منزلت رکھتی ہے۔ ورنہ ذہن دھوکا کھا جاتا ہے یا جنبہ داری مغالطے کی دلدل میں پھنسا مارتی ہے اور ہر مجہول الحال کو مقبول اور ہر معروف الحال کو نامقبول تصور کر لیا جاتا ہے۔ اکثر اوقات یہ نادانستہ طور پر ہوتا ہے ورنہ اگر جان بوجھ کر کوئی اس فعلِ قبیح کا مرتکب ہو تو بسا اوقات سلفِ صالحین کے باب میں سُوءِ ادبی لازم آتی ہے۔ جو معروف ومقبول ہے اسے کوئی مجہول الحال اور غیر مقبول نہیں بنا سکتا اور جو مجہول الحال اور کور ذوق ہے اسے کسی کا زورِ قلم مقبول ومعروف نہیں بنا سکتا۔ نہ زمین، آسمان ہوسکتی ہے اور نہ آسمان کو زمین بنایا جاسکتا ہے۔ چاند پر کون خاک ڈال سکتا ہے۔ ہرن پر کوئی بھی گھاس نہیں لادا کرتا۔ الغرض، اس باب میں اس امر کا لحاظ رکھنا لازم ہے کہ کوئی قلمی کاوش اور کسی کی قلمی کاوش ایسی نہیں جو سہو وخطا سے بالکل ہی پاک اور منزہ ہو۔ ایسا

ہونا شاذ کا حکم رکھتا ہے البتہ تحریر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اغلاط...کی دلدل نہ ہو جس سے ابتلائے علمی پیدا ہو۔ گویا کہ جو تحریر اس اعتبار سے افضل ہوگی اور گوناگوں اوصاف کی بنا پر مقبول و مستند ہوگی اسے ان تحریروں پر ترجیح اور فوقیت ہوگی جو ان خصائص میں اس سے فروتر ہوں گی۔ لیکن اس ترجیح سے کوئی قلم کاری کلامِ الٰہی کے ہم پایہ نہیں ہوسکتی۔ جو کوئی اپنی کورذوقی اور ذہنی کاہلی کی بنا پر امتیاز نہیں کرسکتا اور اس ترجیح و فوقیت کو بہ منزلہ کلامِ ربانی تصور کرتا ہے تو وہ اپنی ذہنی گم راہی کا ثبوت دیتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی کسی مقبول و مستند کتاب کو ہدفِ ملامت بناتا ہے اور اہل اللہ کے جرگے میں مقبول و معتبر اہلِ قلم کو جنبہ دار اور حق فراموش قرار دیتا ہے اور کوئی قابلِ قبول دلیل نہیں دیتا وہ غولِ راہ ہے۔ گم راہ بھی ہے اور گم راہ کن بھی ہے۔

بہر کیف اسالیب کی آگاہی سے کسی قلم کار کے رشحاتِ قلم میں الحاق و تحریف کے بدنما جوڑ اور پیوندکاری کو بخوبی شناخت کیا جاسکتا ہے اور متقدمین میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں اور انھوں نے اس وصف کی بدولت پوری جسارت کے ساتھ حق و باطل میں امتیاز کر دکھایا ہے۔

تحقیق نگار کے لیے یہ بھی ازبس کہ ضروری ہے کہ اس کا اسلوبِ بیان موضوع سے متعلق ہو۔ اگر موضوع سنجیدہ اور علمی ہے تو الفاظ و اصطلاحاتِ علمیہ کو تفوق ہوگا۔ اس کے برعکس اگر عامیانہ اور بازاری اسلوب اختیار کیا جائے تو مطالب خاطر خواہ ادا نہ ہوں گے اور مضمون، ہذیان بن کر رہ جائے گا۔ اسلوبِ بیان سے متعلق تفصیل، میں اپنی متداول کتاب "مضمون نگاری" میں لکھ چکا ہوں۔ مزید معلومات اس سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

۱۱۔ استدلال اور استخراج میں بھی تحقیق نگار کو پوری احتیاط سے کام لینا ہوتا ہے۔ خلافِ واقعہ اور غلط امور کو نتائج سے تعبیر کرنا بہت ہی شرم ناک اور مضحکہ خیز بات ہے۔ مثلاً حال ہی میں ایک استدلال میری نظر سے گزرا جو سخت مضحکہ خیز ہے اور وہ یہ ہے:

> "من بعد میاں مجیب الدین آمدند و ایشاں نیز از یارانِ قدیم حضرت مولانا و از اولاد ہمشیرہ زادہ حضرت سلطان المشائخ قدس سرّہ اند الخ "فخر الطالبین" صفحہ ۲۳، مجتبائی، دہلی"۔
>
> (ترجمہ) بعدازاں مجیب الدین آئے اور وہ بھی حضرت مولانا کے قدیم دوستوں اور حضرت سلطان المشائخ قدس سرہ کے ہمشیرہ زاد کی اولاد سے ہیں۔

اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے:

''گویا کہ چشتیہ نظامیہ سلسلے کے مجدّد کی طرف سے اولادِ خواہر زادہ ہونے کی صریح الفاظ میں تصدیق ہو رہی ہے۔ رسالۂ نظامی، اگست ۱۹۵۸ء، ص ۱۲''۔

سوال یہ ہے کہ اس عبارت میں حضرت مولانا سے مراد حضرت مولانا فخر جہاں رحمۃ اللہ علیہ ہیں یا کوئی اور، اگر مولانا فخر جہاں ہیں اور بلاشبہ وہی ہیں تو یہ ارشاد ان کا نہیں، کسی اور کا ہے۔ وہ ہے مؤلفِ کتاب کا نہ کہ حضرت مولانا فخر جہاں کا جو سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے بلاشبہ مجدّد تھے۔ لہٰذا جب یہ ارشاد حضرت مولانا فخر جہاں کا نہیں تو پھر یہ کہنا کہ چشتیہ نظامیہ سلسلے کے مجدد کی طرف سے اولادِ خواہر زادہ ہونے کی صریح الفاظ میں تصدیق ہو رہی ہے، سراسر لغو اور باطل ہے بلکہ تہمت ہے حضرت مولانا فخر جہاں رحمۃ اللہ علیہ پر اور یہ دلیل خود دعوے کو باطل قرار دیتی ہے۔ بلاشبہ یہ بیان مولف کا ہے جن کا نامِ نامی سیّد نورالدین حسین فخری ہے اور اس کا اطلاق ان ہی پر ہو سکتا ہے۔ حضرت مولانا فخر جہاں رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ گرامی کو اس بیان سے متّہم نہیں کیا جا سکتا۔

بہر حال ایسے استدلال سے لازمًا پرہیز کرنا چاہیے اور ہرگز ایسا غلط اور لغو نتیجہ نکالنا نہیں چاہیے۔ ایسی باتوں سے تحقیق، نظروں سے گر جاتی ہے، اور تحقیر و ذلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اور کوئی منزلت حاصل نہیں کر سکتی، بلکہ مخلوق کی گم راہی کی آفت میں خود قلم کار کو مبتلا ہونا پڑتا ہے۔

۱۲۔ تواتر سے کام شرعی امور میں بھی لیا جاتا ہے اور تاریخ و تنقید میں بھی، لیکن تواتر کی بنیاد بلاشبہ صداقت پر ہوتی ہے اور حقائق پر۔ شریعت میں کسی امرِ حق کا وجود اس کا کوئی قرینہ عہدِ صحابہ رضوان اللہ علیہم میں پایا جائے اور عہد حاضر تک یا زمانۂ زیرِ بحث تک عہد بعہد سلسلہ قائم ہے، یہ ہے شرعی تواتر۔ تاریخ و تنقید کی اصطلاح میں کسی واقعے کا وقوع کسی عہد میں پایا جائے اور اس عہد سے لے کر زمانۂ زیرِ بحث تک عہد بہ عہد اس کے ذکر کا سلسلہ قائم رہے، یہ ہے تاریخی تنقیدی تواتر۔

اگر امرِ واقعہ کی بنیاد حقائق پر نہ ہو تو خواہ عہد بہ عہد اس کا اعادہ ہوتا رہا ہو، اس کو تواتر سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا ورنہ تمام مصائب اور تمام جرائم اور ساری شیطنت تواتر سے متعلّق ہو کر استحقاق کی دعوے دار ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر کسی امر کا وجود فی الحقیقت نہیں، لیکن اہلِ غرض نے غلط شہرت دے دی، اور عہد بہ عہد اس کا اعادہ ہوتا رہا اور ہر عہد میں وہ تاریخ کے اوراق کی زینت بنتا رہا تو وہ بھی تواتر کی مد میں نہیں آتا اور اس سے کسی استحقاق کے لیے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ تواتر کے لیے پہلے کسی امرِ واقعہ کا وجود کسی عہد میں ثابت کرنا ہوتا ہے۔ بعد ازاں عہد بہ عہد اعادہ و تکرار کو تلاش کرنا ہوتا ہے۔ جب یہ دونوں صورتیں مہیا ہوں تو اس وقت اس سلسلے کو تواتر سے تعبیر کیا جائے گا، ورنہ نہیں۔

(الف) ''بلیک ہول''، کلکتہ سے کون واقف نہیں جس کا ذکر ایک طویل مدّت تک چھوٹی بڑی ہر قسم کی کتبِ تاریخ میں جگہ پاتا رہا۔ اس کا وقوعہ ۱۱۹۰ھ/ ۱۷۷۶ء میں بتایا جاتا تھا اور روایت کو اس طرح گھڑا گیا تھا کہ نواب سراج الدولہ والیِ بنگالہ کی فوج کے سپاہیوں نے ایک سو چالیس انگریزوں کو اٹھارہ فٹ مربع کوٹھری میں بند کر دیا تھا۔ جب دوسرے دن کھولا تو صرف تینتیس نفوس زندہ نکلے، باقی سب مر گئے۔ اسی کال کوٹھری کو بلیک ہول کہا جاتا ہے اور یادگار کے طور پر اسے قائم رکھا گیا تھا۔

آں جہانی کامریڈ سبھاش چندر بوس نے تحقیق و تفتیش کے بعد اس کے خلاف آواز اٹھائی اور روایت و درایت سے اس افسانے کا وجود میں نہ آنا ثابت کیا۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے مؤرخ تائید کے لیے نکلے اور خوب خوب زورِ قلم صرف کیا لیکن جھوٹ کو سچ نہ بنا سکے، انجامِ کار اس کا نام و نشان مٹا دیا گیا اور سب سے پہلے کامریڈ سبھاش چندر بوس ہی نے ہتھوڑے کی ضرب اس پر لگائی اور پھر ہاتھوں ہاتھ وہ نیست و نابود کر دیا گیا۔

(ب) ایسا ہی ایک افسانہ وہ ہے جو سومناتھ کے مشہور مندر کے انہدام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور سلطان محمود غزنوی کو اس کا مرتکب قرار دیا جاتا ہے لیکن یہ بھی تحقیق کی تاب نہ لا سکا۔ اس کا وقوعہ ۴۱۵ھ/ ۱۰۲۴ء میں بتایا جاتا تھا مگر محمود کی فتوحات میں اس کا کوئی مذکور نہیں۔ حتیٰ کہ دو سو سوا دو سو برس تک تاریخیں اس کے ذکر سے خالی اور اس عہد کے مورخ لاعلم ہیں بلکہ سومناتھ کی آبادی اور مندر کا وجود عہد مابعد میں پایا جاتا رہا ہے۔ حتیٰ کہ حضرت شیخ سعدی شیرازی رحمتہ اللہ علیہ المتوفی ۶۹۱ھ/ ۱۱۹۱ء نے اس کو آباد دیکھا اور بذاتِ خود وہاں قیام فرمایا اور ''بوستان'' میں اس کا مفصل ذکر موجود ہے۔

چوں کہ اس کی بنیاد صداقت پر نہیں تھی اس لیے یہ کئی صدی پرانا تاریخی اعادہ و تکرار، تواتر کی مد میں نہ آسکا اور انجام کار یہ قصّہ مسترد قرار پایا۔ اس تحقیق کے ہیرو پنڈت سُندر لال جی ••• ہیں۔

(ج) ایک تیسرا افسانہ وہ ہے جو علاء الدین اور پدمنی کے تعشق سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ ملک محمد جائسی، سولھویں صدی عیسوی (۹۴۷ھ/ ۱۵۴۰ء) عہدِ لودھی میں ہندی کے مشہور صوفی شاعر ہوئے ہیں۔ انھوں نے ایک مثنوی لکھی ہے جس کا نام ''پدماوت'' ہے، جو بہت مشہور و مقبول مثنوی ہے۔ اس کی زبان اور اس کی بحر، ہندی ہے مگر رسم الخط اُردو ہے۔ مثنویوں میں عموماً طبع زاد افسانے ہوتے ہیں۔ افسانے، انسانی فطرت کے مطابق تو ہو سکتے ہیں لیکن ان کا

حقائق پر مبنی ہونا لازم نہیں۔ شاید ہی کوئی افسانہ حقائق پر مبنی ہو، اور شاید ہی کسی افسانے میں کسی واقعے کو من وعن بیان کیا گیا ہو، ورنہ تمام تر فرضی ہی ہوتے ہیں۔

ملک محمد جائسی نے پدماوت میں جو قصہ نظم کیا ہے اس کے اہم کرداروں کو چتّوڑ، رتن سین، پدمنی، علاء الدین اور طوطے سے تعبیر کیا ہے اور خود ہی اس نظم کے آخر میں ان کرداروں کی وضاحت اس طرح کی ہے:

> ''چتوڑ سے مراد جسمِ انسانی ہے — رتن سین سے مراد روح ہے — پدمنی سے مراد عقل ہے — علاء الدین سے مراد وسوسہ ہے — اور طوطے سے مراد گرو ہے —''

اور اس طرح قصّے کو تصوّف اور اصلاحِ اخلاق کے رنگ میں رنگ دیا ہے لیکن کچھ افسانہ پسند مورخوں نے اور خصوصًا انگریزی عہد میں انگریز پرست اور فرقہ وارانہ ذہن رکھنے والے تاریخ نویسوں نے اس تمثیلی اور فرضی افسانے کو تاریخی کتابوں میں داخل کر کے ہندو مسلم منافرت کی آگ کو خوب ہوا دی اور اہلِ وطن کو آپس میں لڑا کر گورے آقا کو خوش کرتے رہے لیکن یہ قصہ بھی تاریخ میں مندرج ہونے کے باوجود اور اعادہ وتکرار کے باوجود تواتر کی مد میں نہیں آتا، بلکہ مرفوع القلم اور مسترد ٹھہرتا ہے۔

الغرض تواتر اس عملِ پیہم کا نام نہیں جو حقائق پر مبنی نہ ہو۔ رہی یہ صورت کہ کبھی کسی نے کچھ لکھ دیا اور وہ مدتوں تک کنجِ خمول میں پڑا رہا اور کبھی کبھی اہلِ غرض نے اس کا اعادہ کر لیا، لیکن حقائق پر مبنی نہ ہونے کی بنا پر وہ مقبولیت حاصل نہ کر سکا، تو اس قسم کے اعادہ وتکرار کو تواتر سے تعبیر کرنا کوری جہالت ہے۔ اس کو تواتر سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ تحقیق نگار کو ایسی لغزشوں سے پوری طرح محفوظ رہنا چاہیے۔ یہ خیال بھی بے اصل ہے کہ الحاقات کے جمع کر دینے سے کسی کتاب کی جامعیّت کو مزید تقویت پہنچتی ہے۔ اہلِ علم اس خیال کو صحیح نہیں سمجھتے۔ اگر یہ خیال صحیح ہوتا تو ''تاریخِ واقدی'' سب سے زیادہ معتبر سمجھی جاتی اور اہلِ علم اس کی روایات کو مشکوک نظر سے نہ دیکھتے، اور اس کو افسانہ سرا، اور غلط گو نہ بتاتے۔ وقد قال الشافعی کتب الواقدی کذب (تاریخِ بغداد)

تواتر کا مترادف تسلسل کو قرار دینا بھی عوامیت سے علاقہ رکھتا ہے۔ دور و تسلسل فلسفے کی اصطلاح ہے اور اس کو محال قرار دیا گیا ہے۔ تحقیق نگار کو لازم ہے کہ اس کے قلم سے جچے تلے الفاظ نکلیں تاکہ مفہوم کے ادا کرنے میں کسی طرح کا ابہام باقی نہ رہے۔

۱۳۔ تحقیق میں نکتہ چینی سے بھی کام لیا جا سکتا ہے اور طنز وتعریض سے بھی لیکن اس کے لیے

حالتِ اطلاق بہترین حالت ہے۔ کیوں کہ رمز و کنایے میں جو مزہ ہے وہ پھکڑ بازی میں نہیں۔ تحقیق میں عیب و صواب کو بھی ناپا جاتا ہے لیکن ادب کا دامن ہاتھ سے چھوڑا نہیں جاسکتا۔ ایسے مواقع پر رمزیت اور شگفتہ بیانی کے انچھر خوب کام دیتے ہیں۔ دریدہ دہنی اور بے لگامی ادب و تحقیق کا بھاری عیب ہے، اور سخت معیوب ہے۔ تحقیق کی خوبی یہ ہے کہ دائرۂ ادب میں رہتے ہوئے کمال بے باکی اور دیانت داری سے دادِ تحقیق دی جائے۔

بلاشبہ سلفِ صالحین نے اس بات میں انتہائی جسارت اور کمال صاف گوئی سے کام لیا ہے اور بڑی عرق ریزی اور جاں سوزی سے اسماء الرجال کا ایسا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے کہ جس پر بجا طور سے فخر کیا جاسکتا ہے۔ جس کا اعتراف، مخالفینِ اسلام کو بھی ہے۔ چنانچہ جرمن مستشرق ڈاکٹر اسپرینگر، صاحبِ کتاب ''اصابہ فی احوال الصحابہ'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''اسماء الرجال پر مسلمان جتنا فخر کریں بجا ہے۔ نہ ایسی قوم گزری ہے اور نہ اب ہے، جس نے مسلمانوں کی طرح بارہ سو برس تک علماء کے حالاتِ زندگی لکھے ہوں۔ ہمیں پانچ لاکھ مشہور عالموں کا تذکرہ ان کی کتابوں سے ملتا ہے۔''

خواجہ حالی مرحوم ان بزرگوں کے اس کارنامے کی وضاحت اس طرح فرماتے ہیں:

کیا فاش راوی میں جو عیب پایا
مناقب کو چھانا مثالب کو تایا
مشائخ میں جو قبح نکلا جتایا
ائمہ میں جو داغ دیکھا بتایا
طلسمِ ورع ہر مقدس کا توڑا
نہ ملّا کو چھوڑا نہ صوفی کو چھوڑا

اور اگرچہ ان حضرات کا موضوع انتہائی مقدس اور قابلِ صد احترام ہے لیکن اس کے باوجود انھوں نے وہ اسلوب اختیار کیا کہ ان پر حرف نہیں آسکتا۔ تاریخی تحقیق کا گو منصب نہیں، بلکہ فروتر ہے، اور وہ صرف ترجیح اور ظنِ غالب کا فائدہ بخشتا ہے، جو بتدریج ایقان کے درجے کو پہنچ سکتا ہے۔ تاہم غلط بیانی اور ایسی صاف گوئی جو دریدہ دہنی کی مصداق ہو، تحقیق کے آئین میں کسی طرح بھی روا نہیں، بلکہ قبیح اور مکروہ ہے۔ لہٰذا کسی کو صناع و کذّاب ثابت کرنے سے افضل یہ ہے کہ ایسا اسلوب اختیار کیا جائے کہ زبانِ قلم، مکروہات کی غلاظت سے آلودہ نہ ہو، اور شخصیت کا صحیح پرتو سامنے آجائے

اور نتیجہ خاطر خواہ ذہن نشین ہو جائے۔ یہ انشاء پردازی کا کمال ہے۔ لیکن جنھیں زبان وقلم پر قدرت نہیں، ان سے یہ بات بن نہیں آتی۔ وہ پھکڑ بازی ہی کو اہم جانتے ہیں اور یہ صحیح نہیں۔ تحقیق نگار کو ایسے امور سے مجتنب رہنا چاہیے۔

۱۴۔ طمانیتِ خاطر کے لیے یہ وضاحت بھی بے محل نہ ہوگی کہ ان اصول کی بنیاد نا قابلِ تردید حقائق پر ہے۔ لہٰذا ان سے متعلق بعض اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں:

☆ **یا ایھا الذین امنوان جاء کم فاسق بنباء فتبینوا.** (سورۂ الحجرات)

(ترجمہ): مسلمانو! اگر تمھارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو اچھی طرح اس کی تحقیق کرلو۔

☆ **ولا تطع کل حلاف مھین ھماز مشاء بنمیم مناع للخیر معتداثیم عتل بعد ذالک زنیم ان کان ذامال و بنین** (سورۂ قلم)

(ترجمہ): اور اس شخص کے کہنے میں نہ آنا جو بات بات پر حلف اٹھاتا ہے، آبرو باختہ ہے، طاعن ہے، چغل خوری کرتا ہے، اچھے کاموں سے روکتا ہے، حد سے بڑھ گیا ہے، بد ہے، بدخو ہے، اور ان سب باتوں کے ساتھ جھوٹا نسب بتاتا ہے، اس لیے کہ وہ مال دار ہے اور لڑکوں والا ہے۔

☆ **کلالئن لم ینته لنسفعاً بالناصیة ناصیةٍ کاذبة خاطئة** (سورۂ علق)

(ترجمہ): وہ سن رکھے کہ اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے جو جھوٹی ہے اور خطا کار ہے۔

☆ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سامنے جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت بیان کی گئی:

ان المیت لیعذب ببکاء الحی.

(ترجمہ): مُردوں پر نوحہ کیا جائے تو ان پر عذاب کیا جاتا ہے۔

تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

انّ کم لتحدثون عن غیر کاذبین ولا مکذبین ولکن السمع یخط

(صحیح مسلم کتاب الجنائز)

(ترجمہ): تم لوگ نہ خود جھوٹے ہو، نہ تمھارے راوی جھوٹے ہیں لیکن کان غلطی کر جاتے ہیں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا:

اما انہ لم یکذب ولکنہ نسی او اخطاء

(ترجمہ): ہاں! وہ جھوٹ نہیں بولے لیکن بھول گئے یا خطا کی۔

علامہ مازریؒ ایک حدیث کی نسبت فرماتے ہیں:

اذا انسدت طرق تاویلھا نسبنا الکذب الی رواتھا (نووی شرح مسلم کتاب الجہاد)

(ترجمہ): جب اس حدیث کی تاویل کے سب رستے رک جائیں گے تو ہم راویوں کو جھوٹا کہیں گے۔

''صحیح مسلم'' کے مقدّمے میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے سامنے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے قضایا یعنی مقدّمات کے فیصلے پیش کیے گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اس کی نقل لیتے جاتے تھے اور بعض بعض فیصلے چھوڑتے جاتے تھے اور فرماتے تھے:

یااللہ ماقضیٰ بھٰذا علی الا ان یکون ضل

(ترجمہ): خدا کی قسم علی رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ کیا ہے تو گم راہ ہو کر کیا ہے (لیکن چوں کہ وہ گم راہ نہیں تھے اس لیے یہ فیصلہ بھی نہ کیا ہوگا)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے صرف ان فیصلوں کے مضمون سے یہ قیاس کرلیا کہ وہ صحیح نہیں ہوسکتے۔ اس بات کی ضرورت نہیں سمجھی کہ روایت اور سند کا پتا چلائیں اور انھیں وضّاع اور کذّاب قرار دیں اور پھر مسترد کریں۔

☆**قال ابن الجوزی وکل حدیث رایتہ یخالفہ العقول اوبناقض الاصول فاعلم انہ موضوع فلایتکلف اعتبارہ ای لا تعتبر رواتَہُ ولا تنظر فی جرحھم... ولذا جعل بعضھم ذلک دلیلاً علی کذب راویۃ وکل ھذا من القرائن فی المروی وقد تکون فی الراوی** (فتح المغیث، ص۱۱۴)

(ترجمہ): ابن جوزی نے کہا ہے کہ جس حدیث کو دیکھو کہ عقل یا اصولِ مسلّمہ کے خلاف ہے تو جان لو کہ وہ مصنوعی ہے اس کی نسبت اس بحث کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا نہیں... اور اس لیے بعض (محدثین) نے اس ''لغویت'' کو راوی کے کذب کی دلیل قرار دیا ہے اور یہ تمام قرینے خود روایت سے متعلّق اور راوی کے متعلّق بھی ہوجاتے ہیں۔

فیلحقہ تھمۃ تبدیل المعنی فی روایتہ قبل الحفظ اوقبل العلم حین سمع (فتح المغیث، ص۱۲۱)

(ترجمہ): اسی بنا پر سنتے وقت قلتِ حفظ یا قلتِ علم کے سبب سے روایت کے ادا کرنے میں راوی پر مفہوم کے بدل دینے کا شبہ ہوسکتا ہے۔

فاذا کان الراوی غیر فقیه احتمل الخطا فی فهم المعنی المرادی الشرعی ... ولایلزم نسبة الکذب الخ (ص۴۳۲، شرح مسلم)

(ترجمہ): جب راوی فقیہ نہ ہوگا تو احتمال ہوگا کہ اس نے معنی مقصود شرعی کے سمجھنے میں غلطی کی ہو...(لیکن) کذب کی نسبت لازم نہیں آتی۔

حافظ ابن حجر مکیؒ ایک حدیث کے متعلق فرماتے ہیں:

ان الاخبار التی تشاع ولو کثر ناقلوها ان لم یکن مرجعها الی امر حسی من مشاهدة او سماع لاتستلزم الصدق (فتح الباری، جلد۹، ص۲۵۷)

(ترجمہ): جو خبریں شائع ہوجاتی ہیں خواہ ان کے راوی کثرت سے ہوں، لیکن ان خبروں کی بنیاد امر حسی یعنی مشاہدہ یا استماع نہ ہو تو ان کا سچا ہونا ضروری نہیں۔

ماخذ:

''ارمغانِ تحقیق''، شائع کردہ کتب خانہ انجمن ترقی اُردو، جامع مسجد، دہلی طبع اوّل ۱۹۵۹ء، ص۴۹ تا ۶۰۔